غلط ہی سہی

افسانہ خاتون

212A، رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ۔800010

''مسز خان.....؟''

''بول رہی ہوں.....!''

''آپ نے مجھے پہچانا.....''

''کچھ خیال نہیں آرہا ہے، براہ مہربانی آپ ہی بتادیجئے.....''

''میں.....؟'' ہلکی ہنسی.....''بتاؤں گا تو آپ چونک جائیں گی۔ خیر چلئے، ابھی نہیں بتاتا، مگر مسز خان ایک بات ہے، آپ کی آواز میں ابھی تک وہی کھنک ہے جو راہ چلتے مسافروں کا راستہ روک لیا کرتی تھی، چڑیائیں اپنی چہچہاہٹ بھول جایا کرتیں اور.....''

''کون ہیں آپ.....؟ بتاتے کیوں نہیں.....؟''

فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان کا بے ساختہ جی چاہا کہ ادھر ہی سے لگالیں، مگر انہوں نے فوراً اپنے آپ کو روکا، یہ کیا کر رہی ہوں میں؟ اس طرح تو اپنے آپ کو، اپنی نگاہوں میں گرالوں گی، ہوگا کوئی لفنگا، ایسے ایسے تو ہزاروں راستے میں چلتے رہتے ہیں، مگر.....؟ ایک سوال فوری طور پر ان کے ذہن میں ابھرا۔ وہ کوئی بھی ہو، اس نے ابھی یہ سب

(۲)

کیوں کہا؟ اس نے یہ سب کہنے کے لئے برسہابرس انتظار کیوں کیا — کیا وہ اس کے لیے آج ہی کے دن کا منتظر تھا—؟ آج کا دن....؟ مگر آج کون سا دن ہے...؟

انہیں خیال آیا آج ہی تو انہوں نے اپنی زندگی کا جائزہ لیا تھا، جائزہ کیا ایک طرح سے محاسبہ کیا تھا اور آج ہی.....؟

یوں اپنی باون سالہ زندگی میں انہوں نے کئی بار پیچھے مڑکر دیکھا تھا اور تقریباً ہر بار زیادہ کھونے اور کم پانے کے احساس سے مغلوب ہوگئی تھیں۔ وہ ایک ایسے خاندان کی فرد تھیں جسے نہ معلوم کس غلط فہمی کے تحت متوسط طبقہ کہہ دیا جاتا تھا، جب کہ تھا یہ متوسط طبقے سے کافی نیچے کا طبقہ، اس طبقے کی ایک بڑی پہچان یہ ہوتی ہے کہ یہ بڑے اونچے اونچے خواب دیکھتا ہے جس کا اس کی موجودہ زندگی سے کوئی میل نہیں ہوتا، نتیجہ یہ کہ جو تعبیر آنی چاہئے وہ کبھی ہاتھ نہیں آتی، اگر آتی بھی ہے تو اس کے لئے بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، جن کا اثر فوراً دکھائی نہیں دیتا، گو ہوتا ضرور ہے اور بسا اوقات بہت خراب صورت میں۔ مسز خان بہت خوبصورت کہی جاتی تھیں اور ان کے طبقے میں ان کی خوبصورتی کا شہرہ تھا۔ ویسے وہ خود کو کبھی غیر معمولی خوبصورت نہیں مانتی تھیں۔ ان کی فطری ذہانت نے ان کے اندر کی آنکھیں کھول دی تھیں اور شعور نے انہیں سامنے سے پرے دیکھنے کی عادت ڈال دی تھی۔ اچانک ان کا رشتہ ایک ایسے گھرانے سے آیا جہاں کا بیٹا امریکہ میں رہتا تھا۔ برس دو برس پر آتا تو جیسے اس خاندان کو سماج میں اپنے فاتح ہونے کا احساس ہوتا، بڑے بوڑھے، بچے سب کے پیرز مین سے اونچے اونچے پڑتے۔ وہ لڑکا شادی کے لیے مانتا نہیں تھا، مگر گھر والوں کے پیہم اصرار اور آنسوؤں کے دباؤ میں اس نے ایک شرط رکھ دی، لڑکی بہت خوبصورت ہو اور پڑھی لکھی ہو، حالانکہ اس کے گھر والوں نے امریکی سٹیٹس کو گلے میں ڈال کر بہت اونچی اڑانیں لگائی تھیں، مگر اس کی ضد کے آگے سب زمین بوس ہوگئیں۔ اب غنیمت تھا کہ وہ کم سے کم تیار تو ہوگیا تھا اور مسز خان جیسی لڑکی بھی ان کے سامنے تھی۔ بس چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔

(۳)

خوب دھاچوکڑی ہوئی شادیانے بجے۔ مسز خان کو یہ سب یادیں خواب کی طرح لگ رہی تھیں اور خواب کبھی دیرپا نہیں ہوتا چنانچہ — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا— دولہے میاں کو ایک مہینے کے اندر جو کھیل تماشہ کرنا تھا، وہ انہوں نے جی بھر کے کیا، کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پورے ایک مہینے تک مسز خان کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ اس زمین کی مخلوق بھی ہیں۔ چونکہ شعور بالیدہ تھا اس لیے بار بار ذہن میں یہی بات آتی تھی کہ آخر ان کی کس ادا سے خوش ہوکر مالک نے انہیں یہ خوشیاں بخشی ہیں۔ طرح طرح کے وعدے وعید اور بے شمار خوابوں کی ان دیکھی تعبیر کی جھولی بھر کے دولہے میاں اکیلے ہی امریکہ سدھار گئے۔ ائیرپورٹ کے چھجے سے انہوں نے آخری بار انہیں جہاز کی سیڑھیوں پر دیکھا، پھر وہ ہمیشہ کے لیے اجنبی بن گئے۔ شروع شروع میں کچھ رسمی قسم کے فون اور خط ضرور آئے، مگر ان میں ان وعدوں اور خوابوں کا کوئی ذکر نہیں تھا، جن کی ریشمی ڈوریوں سے وہ انہیں باندھ کر گئے تھے، ان کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ وہ

پاسپورٹ بنوا کر اپنے میاں کے پاس چلی جائیں، آخر کو وہ ان کے میاں ہیں اور ان کا ان پر حق ہے، مگر ان کا کہنا تھا کہ بن بلائے تو آدمی خدا کے ہاں بھی نہیں جاتا، وہ تو پھوٹے منہ بھی نہیں کہتے آنے کے لیے، پھر وہ کس منہ سے ان کے پاس چلی جائیں۔ ادھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کے والدین آگے پیچھے چٹ پٹ دنیا سے منہ موڑ گئے۔ اب تو ان کے آنے کا بھی کوئی سوال نہیں تھا۔ بس وہ سنہرے ایک مہینے کی سوغات ایک بیٹا ان کی زندگی کا واحد سہارا بن گیا۔ انہوں نے اس کی پیدائش کی اطلاع باپ کو دینا اپنا فرض سمجھا۔ جواب میں باپ نے فقط مبارکباد کا ایک پیغام ارسال کیا۔ یہ پیغام کس کے نام تھا، اس سے بس وہی واقف تھا۔

مسز خان کو وہ تمام باتیں ذرا ذرا یاد تھیں۔ یاد میں ان سے کبھی چوک نہیں ہوتی تھی۔ صرف وہ ایک مہینہ جوان کی زندگی کا گویا حاصل تھا، اس کی بات انہیں یاد نہیں تھی، اس وقت وہ اپنے ہوش میں کہاں تھیں کہ یادوں کی پٹاری کھول پاتیں۔ وہ ایک مہینہ ان کا

(۴)

خواب تھا اور بقیہ کی ساری زندگی اس کی تعبیر.....

بہت بعد میں پتہ چلا کہ شوہر صاحب نے امریکہ میں ایک ایسی عورت سے شادی رچا رکھی تھی جس کے پاس وہاں کی شہریت تھی اور اسی کی بدولت انہیں بھی قانونی طور پر گویا امریکن تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یوں ماں باپ ہمیشہ اسی بھرم میں رہے اور اسی کو اپنے سینے میں سیپ کے موتی کی طرح چھپائے دنیا سے چلے گئے کہ بیٹا کی قابلیت کے سبب امریکہ نے ان سے اپنا شہری بن جانے کی درخواست گزاری تھی۔ وہ اس عورت کے چنگل میں یوں پھنسے تھے کہ اس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کو رسماً بھی کبھی امریکہ جانے کی دعوت نہیں دے سکے، نہ اس عورت کو یہاں لانے کی ہمت کر سکے، ویسے وہ تو یہاں اپنے کنوارے ہونے کا بھرم پھیلائے ہوئے تھے۔ اسی بھرم میں مسز خان سے ان کی شادی بھی ہو گئی۔

ان کی امریکہ میں شادی کی خبر مسز خان کے لیے ایسا دھماکہ تھی جس سے وہ بالکل چور چور ہو جاتیں، مگر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا، یوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی عادت انہیں بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو دلاسہ دیا کہ اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ ان کو ویسے بھی یہاں کبھی نہیں آنا تھا اور نہ انہیں کبھی جانا تھا۔ رشتہ ایک طرح سے منقطع ہی ہو گیا، لیکن نہیں، ابھی ایک مرگ ناگہانی اور باقی تھی جو بہ انداز دگر آئی، انہوں نے ادھر ادھر سے انہیں یہ پیغام دیا کہ وہ اگر امریکہ آ کے ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، وہاں عرب اور دوسرے امیر مسلم ممالک کے بہت سے لوگ ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں اور دنیا کو یہ خاموش پیغام دیتے ہیں کہ مسلمان ایک بیوی پر منحصر نہیں کرتا۔

انہوں نے اسی پیغام رساں کی معرفت اپنی عقل، شعور اور تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے جواب دیا کہ انہیں امریکہ میں ایک 'ہاؤس کیپ' کے طور پر رہنا ہرگز منظور نہیں، قسمت نے انہیں جس راستے پر ڈالا ہے، اب وہ اسی پر گامزن رہیں گی۔

(۵)

دراصل دو نکتے فوراً ان کے ذہن میں کوند گئے تھے۔ ظاہر ہے امریکن بیوی ضرور جاب میں ہوگی، وہ شوہر کی کمائی پر تو منحصر نہیں کر سکتی، انہیں بلا واسطہ دعوت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ ان کے گھر کی دیکھ بھال کریں اور ان کے لیے بہترین ہندوستانی کھانا بناتی رہیں، دوسرے یہ کہ امریکی بیوی سے کوئی اولاد نرینہ تو پیدا ہوئی نہیں، صرف دو بیٹیاں ہیں، اتفاق سے انہوں نے بیٹے کو جنم دیا ہے، تو اس کا لالچ بھی دل میں کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہوگا۔

مسز خان جانتی تھیں کہ قسمت نے انہیں جس راستے پر ڈالا ہے وہ جدوجہد کا راستہ ہے، مگر وہ اس راستے سے بھاگ تو نہیں سکتی تھیں، پھر بیٹا اس تاریک اور کٹھن راستے میں روشنی کا ایک مینار تھا جس کے سہارے وہ اپنے قدم آگے بڑھا سکتی تھیں، سو انہوں نے نہایت مضبوطی سے قدم آگے بڑھایا، اپنی نامکمل تعلیم کو پورا کیا۔ محنت اور جانفشانی کے بل پر اسکول میں نوکری حاصل کی اور اپنی ساری توجہ بیٹے کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیٹا نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ایک کمپنی کا اہم عہدیدار بنا اور کمپنی کے ڈیپوٹیشن پر تین سال کے لئے آسٹریلیا چلا گیا، واپس آئے گا تو وہ اس کی شادی کر دیں گی جس کے لیے وہ انہیں اختیار دے کے گیا ہے۔

اپنے جائزہ میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ انہوں نے اپنی باون سالہ زندگی نہیں بلکہ سو سالہ زندگی گزار دی ہے، شاید اس سے بھی زیادہ۔ اسی زندگی میں انہیں وہ سارے مزے چکھنے پڑے جن کے لیے ایک عمر کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی صرف خوشیوں سے تو عبارت نہیں ہوتی، اس میں غم، مصیبت، پریشانی اور کٹھنائی بھی تو ہوتی ہے، ساتھ میں خوشی کی کچھ مقدار بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کسی کو غم اور خوشی کے معاملے میں افراط و تفریط کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، کسی کا حساب برابر نہیں رہتا، اب انہی کے حصے میں خوشی کی بہت مقدار بھی تھی، سو وہ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھیں کہ انہوں نے اس کا مزا چکھا ہی نہیں۔ انہیں بار بار محسوس ہوتا کہ وہ تو اپنے سارے فرائض پوری کر چکیں، وہ تمام کام انجام دے۔

(۶)

چکیں، جنہیں انجام دینے کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ وہ طے کرتیں کہ اب انہیں سمیٹنے کے عمل میں لگ جانا

چاہئے۔ یوں انہوں نے بہت زیادہ پھیلایا نہیں تھا، مگر اس مختصر سے عرصے میں ان کی آنکھوں کے سامنے جو کچھ پھیلا تھا، وہی انہیں بہت لگ رہا تھا اور اسے ہی سمیٹنا کوئی آسان نہیں تھا، لیکن اس فون کال نے تو ان کی دنیا کا رخ ہی موڑ دیا۔ آخر وہ کون ہے جس نے بے دھڑک ایسی باتیں ان سے کہہ دیں جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں، خوشیوں بھرے ایک مہینے میں بھی نہیں۔ وہ بار بار فون کی طرف دیکھتیں، مگر وہ اس طرح خاموش تھا جیسے اس میں کوئی جان ہی نہ ہو، وہ پتھر کا بن گیا ہو۔ اپنی تشفی کے لیے انہوں نے اسے ہلا ڈلا کے بھی دیکھا مگر بے سود۔ جس کا بھی فون تھا، اس کی لائن ابھی برقرار تھی، اس درمیان کسی کا فون نہیں آیا تھا۔ یوں بھی ان کا کسی سے فون پر واسطہ نہیں کے برابر تھا۔ وہ چاہتیں تو ادھر سے اس لائن پر پھر کوشش کر سکتی تھیں، مگر نہیں، یہ تو آ بیل مجھے مار کے مترادف ہوتا۔ اس کا مطلب ہوتا، وہ اس کی باتیں پھر سننا چاہتی تھیں۔ انہیں تو یہ سن کر بے انتہا غصہ آیا تھا، یہ اور بات ہے کہ غصہ فوراً ہی کسی اور چیز میں تبدیل ہو گیا تھا، وہ کیا چیز تھی۔ یہی تو ان کی پکڑ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ آخر ان کی آواز میں کب ایسی کھنک تھی جو راہ چلتے مسافروں کا راستہ روک لیتی تھی، وہ کون سا لمحہ تھا جب چڑیاں اپنی چہچہاہٹ بھول جاتی تھیں اور....اور....اس کے آگے بھی کچھ تھا جو ان کہا رہ گیا مگر اس ان کہی میں شاید بہت سی باتیں پوشیدہ تھیں۔

انہوں نے اپنی پوری جوانی گزار لی، مگر ان ماورائی لمحات سے تو ان کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے تو یہ باتیں کبھی نہیں سنیں، انہیں تو کبھی کسی نے ان باتوں کی اطلاع نہیں دی۔ انہیں اگر اطلاع ہوتی تو ممکن تھا، ان کی زندگی کے سپاٹ راستے میں کچھ ایسے موڑ بھی آتے جو ہری بھری گھاسوں سے بھرے ہوتے، جہاں خوشنما، خوشبودار پھول کھل رہے ہوتے، جہاں چڑیائیں اپنی موسیقیت سے شور مچا رہی ہوتیں.....

(۷)

لیکن نہیں....اس میں کسی اور کا نہیں، صرف ان کا قصور ہے، انہیں ان باتوں کے سننے کی فرصت کہاں تھی، انہوں نے تو اپنی آنکھوں اور کانوں میں مصروفیت کی روئی ٹھونس رکھی تھی۔ اگر واقعی کوئی خفیہ آنکھیں ان باتوں کو دیکھ رہی تھیں اور وہ اس کا اظہار بھی کرنا چاہتیں تو کس سے کرتیں، کب کرتیں...؟

اس جدوجہد کے دور میں، جب وہ اپنے آپ کو تقریباً بھول چکی تھیں، کچھ پیغامات آئے تھے، کچھ قریبی لوگوں نے سنجیدگی سے اس کے لیے کوشش بھی کی تھی، پر انہوں نے بہت سختی سے ان کوششوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ شاید ان پر ترس کی نگاہیں پڑی ہیں، شاید ایک بے سہارا اور تقریباً 'بیوہ' عورت کی زندگی کا ساتھی بن کر کوئی ثواب حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ یہ ثابت کرنے کی دھن میں لگی تھیں کہ وہ دنیا سے کبھی ہار نہیں مانیں گی۔ دنیا اگر انہیں شکست نہ بھی دے، پھر بھی دنیا کے ساتھ ان کا معاملہ ڈال ڈال اور پات پات کا رہے گا۔ بہت حد تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئیں، مگر ایک ادھورے، انجانے اور بے ضرر سی فون کال نے انہیں اپنے آگے بڑھتے ہوئے راستے پر پھر واپس مڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آخر کس کو کیا پڑی کہ اس نے ان کو فون کر دیا، وہ بھی اس انداز میں جیسے وہ انہیں برسوں سے جانتا ہو۔ انہوں نے سوچا، اگر وہ کسی پیغام کو قبول کر لیتیں تو شاید ان باتوں کے سننے کا ایک موہوم سا راستہ کھل جاتا، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ باتیں کسی شکست خوردہ کے دل سے نکل رہی ہوں، مگر اسے اتنے دنوں بعد کیوں خیال آیا—؟

اس وقت اگر یہ باتیں کانوں میں پڑ جاتیں تو یقیناً ان کی سوچ اور جذبات کو ہلا کے رکھ دیتیں۔ آج عمر کے اس پڑاؤ پر بھی ان باتوں نے ان کی دنیا میں ایک ہلچل مچا دیا اور انہیں بکھیر کر رکھ دیا۔ وہ تو سمیٹنے بیٹھی تھیں، سارا پروگرام الٹ پلٹ ہو گیا۔ ذہن بس فون کی ایک آواز پر مرکوز ہو گیا۔ ان کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا، یک ٹک وہ فون کو تک رہی تھیں، ایک ایسے آلے کو جس میں کوئی جان نہیں تھی، آواز کی روح پھونکی جاتی تب ہی

(۸)

وہ اس کے تابع ہوتا اور بس۔

معاً انہیں خیال آیا کہ وہ کوئی رانگ نمبر بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی نے ان کے لئے نہیں، کسی اور کے لئے ان جذبات کا اظہار کیا ہو، اس کے انداز سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ کسی پرانی شناسا سے مخاطب ہو، رانگ نمبر نہیں ہوتا تو یقیناً پھر فون آتا اور یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہتا۔

رانگ نمبر کا سوچ کر ان کی طبیعت مرجھائی ضرور، مگر انہوں نے حوصلہ نہیں گنوایا۔ اگر یہ رانگ نمبر ہی تھا تو اس نے ان کی خزاں رسیدہ زندگی میں تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، بہار ضرور لا دیا تھا۔ وہ جیسے سپاٹ راستے پر چلتے چلتے ایک دم رک گئی تھیں اور انہیں آس پاس خوشبوؤں اور رنگ کا ایک عجیب سا احساس ضرور ہوا تھا اور یہ تو اپنی اپنی سوچ تھی کہ آدمی کچھ سوچ کے خوش ہو جائے، کچھ سوچ کے مرجھا جائے۔

مسز خان اپنی اس سوچ سے ہرگز پیچھے ہٹنا نہیں چاہتی تھیں۔ یوں بھی اب ان کی زندگی میں کون سا نیا انقلاب آنے والا تھا۔ صرف سوچ اور فکر کے سہارے ہی تو انہوں نے یہاں تک کا سفر طے کیا تھا اور اب بھی.....

انہوں نے سوچا، دنیا میں کتنے لوگ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ جو غلط راستے پر چل رہے ہیں، کیا ان کی چال رک گئی ہے—؟

انہوں نے تو صحیح یا غلط کسی راستے کو اختیار نہیں کیا، بس اپنی سوچ کو وہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے ذہن سے ساری باتیں نکال دیں اور اپنی نگاہیں.....منتظر نگاہیں فون پر گاڑ دیں۔ ○○